AL-NOOR
P ISSN: 3005-8252
O ISSN: 3005-8260
VOL: 03 NO: 01 2024

نعیم صدیقی کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ[1]

A Critical Review of Naeem Siddiqui's Ghazal Goi

*زوبیہ لطیف (ایم فل اسکالر)

Abstract:

This article is about composing by name sidiqi .composing of ghazal is the most important and reliable tradition of Urdu poetry. that if it is excluded from the Urdu literature, the bloom of literature its atmosphere will start to look depressed and lifeless. Similarly, Rashid Ahmad Siddiqui has also described Ghazal as the prestige of Urdu poetry. 2 Rather, it should be understood that wherever Urdu poetry is mentioned, the mind is first inclined towards Ghazal. Ghazal is actually the name of this light-hearted, imaginative and painful state of speech which is born from the combination of emotions of pain and passion. It is especially striking in sweet style and imaginative words. The main feature of this slow music of words and emotions is that its delicacy is not affected by any kind of gravity and any kind of restraint. The structure of Ghazal is outwardly formed by soft, smooth and sweet words, but its soul emerges from the subtleties that are the result of pleasure, pain and passion

***Keyword*: Poetry, Analysis, Traditional Poetry**

غزل کی تعریف

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے الفاظ ہیں:

’’غزل گوئی اردو شاعری کی سب سے اہم اور معتبر روایت ہے۔ اتنی اہم اور معتبر کہ اگر اسے اردو شاعری کے ایوان سے خارج کر دیا جائے تو اس کی فضا افسردہ اور بے جان نظر آنے لگے۔‘‘ ۱

اسی طرح رشید احمد صدیقی نے بھی غزل کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیا ہے۔۲بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ جہاں کہیں اردو شاعری کا ذکر آتا ہے، ذہن سب سے پہلے غزل کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس کے لغوی و اصطلاحی معانی کی بحث سے قطع نظر یہ جاننا زیادہ ضروری ہے کہ غزل کو کون سے عناصر غزل بناتے ہیں:

ڈاکٹر سید عبداللہ نے غزل کی تعریف یوں کی ہے:

''غزل دراصل بیان کی اس دل آسا، خیال انگیز اور دردمندانہ کیفیت کا نام ہے جو جذباتِ درد و شوق کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے اس کا پیرایہ بیان رمزی اور ایمائی ہوتا ہے۔ یہ شیریں سبک اور خیال انگیز لفظوں میں خاص طور پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ الفاظ و جذبات کی اس دھیمی موسیقی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی لطافت کو کسی قسم کا ثقل اور کسی نوع کی رکاکت گوارا نہیں۔ غزل کی عمارت خارجی طور پر سبک، سلیس اور شیریں الفاظ سے تیار ہوتی ہے، مگر اس کی روح ان لطافتوں سے ظہور میں آتی ہے جو لذت الم اور درد و شوق کا نتیجہ ہے۔'' ۳ـــہ

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے غزل میں ''جذبات کی شدت'' کو اس کا ایک بنیادی عنصر قرار دیا ہے۔۴ـــہ اور سید عابد علی عابد غزل کے لیے درج ذیل لوازمات کو ضروری سمجھتے ہیں:

۱- غزل کو اصلاً نازو نیاز کی کیفیات اور حسن و عشق کی واردات سے مربوط ہونا چاہیے۔
۲- زبان جہاں تک ہو سکے نرم و شیریں اور بیان دلکش اور دل پذیر ہونا چاہیے۔
۳- غزل کو ابتذال اور چھچھورپن سے پاک ہونا چاہیے۔
۴- محبوب سے خطاب کا انداز و اسلوب نیاز مندانہ ہونا چاہیے۔
۵- جہاں تک ہو سکے تعقید لفظی و معنوی سے اجتناب کرنا چاہیے تاکہ بات پیچیدہ نہ ہو جائے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں:

''غزل کا موضوع دراصل عشقِ مجازی ہے۔''۶ـــہ

ایک طویل عرصے تک عشق مجازی اور اس کی مختلف کیفیات کے بیان ہی کو غزل کا موضوع تصور کیا جاتا رہا تھا۔ سب سے پہلے مولانا الطاف حسین حالی نے غزل کے موضوعات میں اضافے کی طرف توجہ کی۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہر وہ بات جس کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے، خواہ اس کا منشا خوشی ہو یا غم، یا حسرت یا ندامت، یاشکر یا شکایت... یا شوق یا انتظار یا حب وطن یا قومی ہمدردی یا رجوع الی اللہ یا حمایت دین و مذہب یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کا خیال یا کوئی اور جذبہ جذباتِ انسانی میں سے، اس کو بھی غزل میں بیان کر سکتے ہیں۔''۷ـــہ

انھوں نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ غزل کو بہ اعتبار مضامین اور خیالات جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیے۔۸ـــہ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ غزل کادامن اتنا وسیع ہے کہ اسے محض عشق مجازی تک محدود کر دینا صنف غزل کے ساتھ ظلم ہے۔ رشید احمد صدیقی غزل کو اسی لیے ایک نقطۂ نظر، ایک اندازِ فکر، ایک اصول تلخیص اور سلیقۂ اظہار قرار دیتے ہیں۔۹ـــہ

حالی نے اردو غزل میں مقصدیت اور اصلاح کا رنگ بھی پیدا کیا۔ بقول نظیر صدیقی، اقبال نے آگے چل کر اس مقصدیت کو شعریت سے آشنا کیا۔۱۰ـــہ اقبال نے اپنی غیر معمولی مفکرانہ اور شاعرانہ صلاحیتوں سے کام لے کر بامقصد شاعری

میں ایسی توانائی اور رعنائی پیدا کر دی جو اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:
’’اپنی بے مثال فنی مہارت اور منفرد فکری عظمت کی بنا پر علامہ اقبال کو اردو شعرو ادب کی آبرو کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ مقصد اور فن کا ایسا متوازن اور حسین امتزاج عالمی ادب میں بھی مشکل ہی سے ملے گا۔‘‘ ۱۱؎
اقبال نے غزل کے لیے جو لہجہ اور زبان اختیار کی وہ ان کی اپنی وضع کردہ ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں کے ذریعے یہ محسوس کرایا کہ عشق و محبت دل کا ہی نہیں ذہن کا ماجرا بھی ہے۔ یہ تصور جدید غزل گوئی کی بنیاد بھی بنا اور بقول رشید احمد صدیقی:
’’یہ کہنا حقیقت سے دور نہیں کہ ایک نامعلوم مدت تک غزل ہی نہیں بلکہ اردو شاعری کی جملہ اصناف کا اعتبار و امتیاز اقبال کے دیے ہوئے معیار سے متعین ہو گا۔‘‘۱۲؎
اقبال کے علاوہ اردو غزل کو جن شعرا نے متاثر کیا ان میں حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی اور فراق گورکھپوری شامل ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کا رنگِ تغزل ایک دوسرے سے مختلف ہے۔۱۳؎
اردو غزل کا پس منظر بہت طویل ہو سکتا ہے البتہ نعیم صدیقی نے جس دور میں غزل گوئی کا آغاز کیا وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ ترقی پسند شعرا کی توجہ غزل سے زیادہ نظم پر مبذول رہی۔ ترقی پسند تحریک کے بعد سے اب تک غزل گو شعرا اس کثرت سے سامنے آ رہے ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ دورِ حاضر کے شعرا کے ہاں مقبول موضوعات زندگی کی غیر مشروط ترجمانی اور نئے انسان کی دریافت ہیں۔ اس طرح سے غزل میں انسان کے تاریخی و تہذیبی شعور، ملک، مذہب، سیاسی رویوں غرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلو سموئے جا سکتے ہیں۔۱۴؎

نعیم صدیقی کی غزلیات

نعیم صدیقی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ یہ بات بہت حد تک درست ہے، لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ غزل کے شاعر نہیں ہیں۔ عام طورپر شعرا کسی ایک صنفِ سخن میں مہارت رکھتے ہیں، لیکن بیک وقت دو تین اصناف پر دسترس رکھنے کا اعزاز بہت کم شعرا کو نصیب ہوتا ہے۔ قدرت نے انھیں شاعری کا بہت زبردست ملکہ عطا کیا ہے اور نعیم صدیقی نے اس عطیۂ قدرت کا بھرپور طریقے سے استعمال کیا ہے۔ انھوں نے بہت سی غزلیں کہیں، لیکن شعلہ خیال کے سوا ان کے کسی اور مجموعے میں غزلیات شامل نہیں ہیں اور شعلۂ خیال کی غزلیات بھی ایک خاص واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہیں، لہٰذا ان کی غزل گوئی شاعر ی کے تمام پہلوئوں پر محیط نہیں ہے۔ نعیم صدیقی کی غزل کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمیں رسائل سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ بالخصوص سیارہ (لاہور) اور چراغِ راہ (کراچی)جو نعیم صدیقی کے زیر ادارت شائع ہوتے رہے ہیں۔۱۵؎ نعیم صدیقی کی غزل کا مطالعہ کرنے کے بعد درج ذیل اہم پہلووں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔
۱۔ عشق کا جذبہ انسان میں آفرینش ہی سے ودیعت کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عاشقی کی روایت نہ دنیا میں کبھی ختم ہو گی اور نہ شاعری میں۔ معشوق تو بدل سکتے ہیناور بدلتے رہتے ہیں، لیکن عاشق اور اس کا عشق تاقیامت مسندِ عاشقی پر جلوہ افروز رہیں گے۔ نعیم صدیقی کی غزلوں میں جو پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے وہ اسی عشق کی کارفرمایاں ہیں۔ شعلۂ خیال کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں:

’’عشق عمل کے میدان میں اپنے اظہار کے لیے جو سب سے اونچی صورت اختیار کر سکا وہ ’’جہاد‘‘ ہے، لیکن نطق و کلام کی دنیا میں وہ اپنے آپ کو شعر سے زیادہ کسی اور پیرائے میں کبھی پیش نہیں کر سکا۔ شعر کی مختلف اصناف میں سے خاص طور پر غزل وہ صنفِ نازک ہے جس کی فطرت پر از اول تا آخر عشق پر تو افگن ہے۔‘‘ ۱۶؎

نعیم صدیقی کے اشعار میں سرمستی اور سرشاری کی کیفیت چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ محبوب کے حسن و جمال کے تذکرے کرتے ہیں، اس کے ناز و ادا کی تعریف کرتے ہیں، ہجر و فراق کی کیفیات کا بیان اور کبھی کبھار وصل کی صورت میں حاصل ہونے والی لذت بھی نظر آتی ہے، لیکن ان کی عاشقانہ شاعری کا نقطۂ امتیاز یہ ہے کہ ان کا معشوق ایک نظریہ اور نظام ہے جو ان کے لیے سرچشمہ عشق قرار پاتا ہے: ؎

تری راہوں میں تپتی ریت کے دامن پہ سر رکھ دوں
لبِ ہر خارِ رہ پر اپنی اک قاشِ جگر رکھ دوں
یہ میرا مشغلہ ہے ظلمتوں کی حکمرانی میں
دیے کرتا رہوں روشن، ادھر رکھ دوں، ادھر رکھ دوں
جنونِ شوق کہتا ہے کہ خود آگے نکل جاؤں
متاعِ زندگی ساری کنارِ راہ گزر رکھ دوں۱۷؎

نعیم صدیقی کے ہاں عشق میں وقار، ضبط اور عظمت عشق کا خاص انداز نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مصائب و آلام کو بڑی چیز نہیں سمجھتے اور راہِ عشق کالازمہ جان کر بڑی استقامت سے ڈٹے رہتے ہیں۔ ؎

شہانہ ہے وقار اپنا، ہے استغنا شعار اپنا
مزاجِ عاشقی آفات پر برہم نہیں ہو گا
مجھے پہلے ہی طولِ سعی مقصد کا ہے اندازہ
مرورِ وقت سے جذبہ مرا مدہم نہیں ہو گا
لگا دی جس کی خوشنودی کی خاطر جان کی بازی
وہ جانِ جاں بھی کیا اس راز کا محرم نہیں ہو گا ۱۸؎

نعیم صدیقی کے ہاں عشق ایک پاکیزہ جذبے کے طورپر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ اس میں ظاہر داری اور بازاری پن کی کوئی گنجایش نہیں سمجھتے۔ ایک غزل میں عشق کے جذبے کی پاکیزگی، صداقت اور خلوص کو اس طرح بیان کرتے ہیں: ؎

ہم نے راتوں کی سیاہی کو ستائے رکھا
تیری یادوں کے چراغوں کو جلائے رکھا
جسمِ خاکی پہ گزرتی رہی جو بھی گزری
دل تری چیز تھا سو اس کو بچائے رکھا
اپنی ہستی میں ہے گر کچھ تو اسی باعث ہے
اپنی ہستی کو تری راہ میں لٹائے رکھا
ہم چلے ٹھوکریں کھا کھا کے گرے پھر اٹھے
اک امانت کا بڑا بوجھ اٹھائے رکھا۱۹؎

عشق کی راہوں پر چلتے ہوئے انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ اس سفر میں منزل کا ملنا بہت دشوار ہے۔ وہ اس پر ترکِ سفر کرنے کے بجائے اس جذبے سے آگے بڑھتے ہیں: ؎

رکو تھمو نہیں، ترکِ سفر ہے مرگِ قلوب
تمام منزلیں گم ہیں تو رائیگاں ہی چلو ۲۰؎

یہاں تک کہ عشق کی راہوں پر اگر کوئی ہمسفر نہ ملے تو تنہا ہی چل نکلنا چاہیے۔ یہ ایسا جذبہ ہے جس پر اگر ڈٹ جایا جائے تو زمانہ قدر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے: ؎

ہے شوقِ منزل ہی آپ رہبر، بھٹک کے پھر راستا ملے گا
اکیلے ہو تو اکیلے نکلو، زمانہ خود ساتھ آ ملے گا۲۱؎

نعیم صدیقی اگرچہ نظریہ اسلامی کے فدا کار ہیں، لیکن عشق کی ان ساری منزلوناور احوال و مقامات سے گزرے ہیں جو کسی پیکرِ نسائی کی محبت سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے اشعار پڑھتے ہوئے کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ خالی خولی مقصدیت کی ترویج اور نظریے کا پرچار کیا جا رہا ہے، بلکہ مجاز کی استعاریت میں ڈوبے ہوئے یہ اشعار غمِ جاناں کی عمدہ تصویر نظر آتے ہیں۔

ہجر کی طویل راتیں سب کو بھاری لگتی ہیں، نعیم اس کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

؎کوئی ذکرِ حسنِ خوباں، کوئی عشق کا فسانہ
کس طرح رات کاٹیں، کوئی دلکشا بہانہ۲۲؎

پھر خود ہی نکتہ آفرینی کی ایک خوب صورت مثال کے ذریعے اس کا جواب دیتے بھی نظر آتے ہیں:

؎تم نہیں آ سکے تو خیر اپنی بھی رات کٹ گئی
سوئی پڑی تھیں حسرتیں ان کو ذرا جگا لیا۲۳؎

عشق کی معنوی پرتوں کے ساتھ ساتھ نعیم صدیقی کے ہاں خالص مجازی عشق کے اشعار بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ جمال محبوب کی تعریف میں بہت سی غزلیں نظر آتی ہیں:

؎عجب اسے دیکھا وہ مجھ کو چاند کا ٹکڑا لگا
وہ ہوا چیں بہ جبیں تو اور بھی اچھا لگا
پھول ہو یا چاند یا فانوس یا رنگِ شفق
جو بھی منظر تھا حسیں وہ آپ کا مکھڑا لگا۲۴؎

چھوٹی بحر کی ایک غزل میں اوصاف محبوب کے علاوہ قافیے کی خوب صورتی بھی دیکھنے کے لائق ہے: ؎

محیطِ دورِ جہاں تیرا حلقۂ گیسو
افق ہزار زمانوں کا یہ خمِ ابرو
ترا خرام ہے تمثالِ باد صبحِ بہار
ترا کلام ہے مانندِ موجِ نغمۂ جو۲۵؎

روایت کی پیروی میں محبوب کے چہرے، زلف اور چال کا تذکرہ ذیل کے اشعار میں بھی ملے گا:

؎چہرہ ہے صبحِ جانفزا کی طرح
زلف امڈی ہوئی گھٹا کی طرح
گل کترتا ہوا خرام تیرا
صبح کے موجۂ صبا کی طرح۲۶؎

عشقِ مجازی میں نعیم صدیقی کے ہاں ابتذال، عریانی یا رکاکت کا ذرا سا پہلو بھی نظر نہیں آتاشوخی اور رنگینی اپنی جگہ لیکن عشق میں عریانی اور بے باکی کے وہ قائل نہیں ہیں۔ ان کا مجازی محبوب بھی بہت باحیا نظر آتا ہے: ؎

مجھ کو ہزار جلوۂ بے باک سے عزیز
ان شرم سے جھکی جھکی آنکھوں کا التفات۲۷
؎دو حرفِ مدح پر نچڑ گئے انار چہرے پر
یہ اقتضائے جذبۂ حیا ہے اور کچھ نہیں۲۸؎

؎اداسی ادا بھی، حیا سی حیا بھی
عدیلِ سخن بھی، قتیلِ صبا بھی۲۹؎

نعیم صدیقی کے ہاں اگرچہ محبوب سے ایک پاکیزہ ہستی کا تصور ابھرتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اس کے جور و ستم اور بے وفائی کا گلا کرنے سے نہیں چوکتے:

؎دل آزاری طریق اس کا، جفا کاری شعار اس کا
دلِ ناداں کو پھر بھی ہے ہمیشہ انتظار اس کا ۳۰؎

؎اندازِ جفا ان سے نہ چھٹے وہ پھر بھی ہمیں محبوب رہے
تا عمر صلیبِ درد پہ ہم لب بند رہے مصلوب رہے ۳۱؎

؎تمھارے اس چہرۂ کتابی کی روشنی میں کئی شبوں تک
کتابِ الفت کو ہم نے دیکھا وفا کا پہلا ہی باب گم ہے ۳۲؎

نعیم کی غزلیہ شاعری کا بڑا حصہ انہی حسن و عشق کے مضامین کے گرد گھومتا ہے۔ عشقِ حقیقی ہو یا مجازی یا کسی نظریے و نصب العین کا عشق، نعیم صدیقی نے اسے بہت سلیقے سے بیان کیا ہے۔

۲

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''غزل صرف شوق و رغبت کا نام نہیں، اس میں درد و کسک کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔''۳۳؎

نعیم صدیقی کی غزل میں درد اور کسک کا انداز بعض اوقات ہلکا اور بعض اوقات بہت گہری صورت میں سامنے آتا ہے۔ ؎

بہ محشر، قلبِ مضطر، جانِ بسمل لے کے آیا ہوں
حیاتِ رائیگاں کا بس یہ حاصل لے کے آیا ہوں
امیدیں، آرزوئیں، حسرتیں، ارماں، تمنائیں
صدا ہو پھر ترے ناوک کے قابل لے کے آیا ہوں۳۴؎

انفرادی زندگی میں بھی اس گہرے درد کی مثالیں ملتی ہیں: ؎

پلکوں سے چن رہا ہوں میں پامال کرچیاں
پہلے تو ریزہ ریزہ مری ذات یوں نہ تھی
؎اذیتوں کا تسلسل، عقوبتوں کا ہجوم
یہ زندگی ہے کسی جرم کی سزا کی طرح

نعیم صدیقی کے بعض اشعار کو دیکھ کر تو یوں لگتا ہے کہ جیسے دل کی آگ کو لفظوں میں اور لہو کی حدت کوروشنائی میں ڈھال کر غزل کہنے کا فن انھیں قدرت نے وافر مقدار میں عطا کیا ہے۔ ذیل کے اشعار میں درد اور کسک کی لہر انفرادی تجربے سے نکل کر اجتماعیت کے دائرے میں داخل ہو گئی ہے۔

؎شخصیتوں کی کرچیاں پھرتے ہیں لے کے لوگ
شیشے کی طرح ٹوٹ کر انساں بکھر گیا
حاصل تھا زندگی کا ذرا سا سکونِ دل
وہ یاں میانِ کوچہ و ایواں بکھر گیا۳۷؎

نعیم صدیقی کے ہاں ایسے اشعار اچھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں جن میں حکمت کی باتیں اور تربیت کے لیے پندو نصائح کا پہلو نمایاں ہے۔ مذہب، تاریخ، حالاتِ حاضرہ سے واقفیت اور سب سے بڑھ کر خدا کو جواب دہی کا احساس انھیں اس میدان میں بھی دعوت و تبلیغ سے باز نہیں رکھتا۔ اعلیٰ اخلاق کی ترویج، خدا سے امداد طلب کرنے کا جذبہ اور برائیوں سے اجتناب کا سبق ان کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ باتوں ہی باتوں میں حکمت کے بہت سے اسرار بھی بیان کر دیتے ہیں: ؎

قرب مطلوب جسے ہو ان کا
پہلے خود اپنے سے بیگانہ بنے۳۸؎
؎تقدیر ساز سے بھی ذرا رسم و راہ کر
پھر اپنے ہاتھوں اپنے مقدر کی لکھ کتاب۳۹؎

وہ جبر ا ور زبردستی کے ذریعے کی گئی نصیحت کو سود مند خیال نہیں کرتے بلکہ قلوب کی تبدیلی پر زور دیتے ہیں:

؎صنم خانے گرانے سے بہت کم دل بدلتے ہیں
ذرا سا اذن دو مجھ کو بتوں کو رام کرنے دو ۴۰؎

نعیم اپنی شاعری میں خودداری اور استغنا کا سبق بار بار یاد دلاتے ہیں اور ہر بار نیا اور خوب صورت پیرایہ بیان ہوتا ہے:

؎سر کے بل چل کے سردار تو پہنچوں گا مگر
سر جھکا کر سرِ دربار نہیں آئوں گا۴۱؎
اگر رہ کے پیاسا تو ساغر نہ مانگے
تو اک دن یہ مینا ترے ہاتھ ہو گی ۴۲؎

گوہر مقصود حاصل کرنے کی طلب ہر ایک دل میں ہوتی ہے، لیکن نعیم صدیقی ساتھ ہی خبردار بھی کرتے ہیں کہ ناجائز راستوں سے حاصل کی گئی کامیابی کبھی خوشی اور اطمینان مہیا نہیں کرتی: ؎

؎وہ ترکِ عشق پہ دیتے ہیں اذنِ نظارہ
اب اس حقیر سی سوداگری پہ کیا لینا۴۳؎

نعیم صدیقی آنے والی نسلوں کے نام یہ پیغام دیتے ہیں: ؎

؎میں جانتا ہوں خزانۂ عشق برسرراہ لٹ رہا ہے
مگر صداقت کے سچے موتی کسی طرح سے بچائے رکھنا
یہ عصرِ نو ہے وفا کی قدروں، روایتوں کو مٹانے والا
حسین یادوں کے پھول سارے دل و جگر میں سجائے رکھنا
جدھر بھی دیکھو شکستہ امیدیں، مردہ جذبے، فسردہ نظریں
تم اپنے رنگین پیارے خوابوں کی پاک نگری بسائے رکھنا ۴۴؎

۴

زاہد کی دنیاداری، واعظ کی ریاکاری اور شیخ کی منافقانہ روش کی داستانوں سے دامنِ غزل مالا مال ہے۔ شعرا نے اپنے طنز کے تیر ان پر خوب خوب چلائے ہیں۔ نعیم صدیقی کے ہاں بھی یہ انداز نظر آتا ہے۔

؎ان عباپوشوں کے وعظوں سے حذر
آستینوں میں صنم رکھتے ہیں۴۵؎
توحید کے پردے میں وہ خود ہی مہا بُت ہیں
وہ جا کے حرم کو بھی بت خانہ بنا لیں گے ۴۶؎

سادہ لوح عوام کو دین کے ذریعے دھوکا دینے کی روش پر اس طرح کا طنز کرنا بجا معلوم ہوتا ہے:

؎کافر بتوں سے عشق میں لینا ہدایتیں
پڑھنا ثواب کے لیے قرآن کی آیتیں۴۷؎
؎لب پہ خدا کا نام ہے دل میں بتِ مفاد
ایمان و کفر دونوں کو باہم نہ یوں ملا۴۸؎

نعیم صدیقی نے رہنمائی کا فریضہ انجام دینے والوں کے اس حال پر طنز تو کیا ہے، لیکن ان کے اس طنز کے پیچھے ایک گہرا درد بھی کام کرتا نظر آتا ہے،ایک ناتمام خواہش کا اظہار ہوتا ہے کہ کاش ایسا نہ ہو۔

۵

عشق و محبت اور دیگر معاملاتِ زندگی کے حوالے سے نعیم صدیقی کے ہاں انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ نظر آتا ہے۔ انھوں نے دورِ حاضر کے شاعروں کی سی نفسیاتی موشگافیاں نہیں کی ہیں بلکہ ایک تجربہ کار شخص کی طرح حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوئوں کا مطالعہ کر کے شاعرانہ پیرائے میں ان کا اظہار کر دیا ہے۔ ذیل کے اشعار نفسیاتی رمزوں سے ان کی آگاہی کی مثال ہیں:

ــوہ دور جا کے یہ چاہیں کہ رابطہ بھی رہے
قریب جاوں تو خواہش کہ فاصلہ بھی رہے۴۹ــ

ــہم اپنی توبہ کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں
گھٹائیں جھوم کے آنے میں احتیاط کریں۵۰

ــاگرچہ ان کی خو فقط جفا ہے اور کچھ نہیں
مگر یہ سب جفا فقط ادا ہے اور کچھ نہیں
ــخیال ہی خیال میں گزر رہے ہیں روز و شب
یہ عشق کی خموش ابتدا ہے اور کچھ نہیں۵۱ــ

عوام کے اجتماعی رویےکی طرف ایک اشارہ: ــ
ہیں اضطراب کے مارے ہوئے عوام مگر
یہ روز ایک نیا اضطراب مانگتے ہیں۵۲ــ

نعیم صدیقی کا یہ شعر بھی ان کی شاعری کی درج بالاخصوصیات پر پورا اترتا ہے:

ــفن میں نظر آئے گا تمھیں اپنا ہی چہرہ
شاعر تو بے چارا فقط ایک آئینہ گر ہے۵۳ــ

۶

نعیم صدیقی ایک حساس شاعر ہیں اور ان کے ہاں ہمیں معاشرتی رویوں اور زمانے کی کج ادائیوں پر ردعمل بھی ملتا ہے۔ وہ تہذیبِ حاضر کی چمک دمک کے ہاتھوں اخلاق و اقدار کی پامالی کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں:

ــتہذیبِ سیم و زر کی ہیں کیا کیا طرب سامانیاں
لیکن دلوں کی دوستو! بڑھتی ہوئی ویرانیاں
پھیلا ہوا ہے ہر طرف بازارِ عیش و انبساط
مردہ ضمیروں کے عوض ملتی ہیں تن آسانیاں۵۴ــ

ضمیرفروشی، جاہ طلبی، ریا پسندی اور بے حسی ''تہذیب'' کے عطا کردہ ایسے تحفے ہیں جو انسانیت کو شرمسار کرنے کے لیے کافی ہیں۔ نعیم صدیقی ان رویوں پر طنز بھی کرتے ہیں: ــ

لبوں پہ کلامِ دلکش، دلوں میں فسادِ نیت
ہوئی عام شہر بھر میں، روشِ منافقانہ۵۵ــ

ــتہذیب کا یہ حاصل مایوس کن ہے کتنا
انساں کے سائے تک سے انسان ڈر رہا ہے
اس بزم معدلت میں، ہر پیکرِ جرائم
ہر بے گنہ پہ بڑھ کے الزام دھر رہا ہے۵۶ــ

نعیم صدیقی کے ہاں بعض اوقات شہر آشوب کی صورت پیدا ہو جاتی ہے:

ــاس دورِ دوں نہاد میں اوباش باوقار
اس عہد ناسعید میں اشراف ہیں خجل
گھر سے نہ اب نکل کہ فضا ہے ہوس زدہ
میرا تو مشورہ ہے کہ مجھ سے بھی اب نہ مل۵۷ــ

اگرچہ نعیم صدیقی کو نوجوان نسل سے بہت سی امیدیں ہیں جن کا اظہار ان کی بیشتر نظموں میں ہوتا ہے، لیکن بزرگوں کے احترام سے عاری اس نسلِ نو سے شکوے کا انداز بھی نظر آتا ہے: ؎

تہذیب عصرِ نو نے اٹھایا یہ انقلاب
پیری پہ حملہ کش ہیں ابھرتی جوانیاں۵۸؎

کبھی کبھی وہ جھنجھلاہٹ اور بیزاری و ناامیدی کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ پیہم جدوجہد میں ناکامی، پے در پے امیدوں کے ٹوٹنے اور زمانے کے چلن پر ایسی کیفیت کا پیدا ہو جانا بہت غیر فطری نہیں ہے: ؎

مجھ کو قسمت میں کیسی یہ دنیا ملی، گوشے گوشے میں نالہ کناں آدمی
ہر طرف جبر کا سیلِ آتش رواں، ہر طرف ایک طوفانِ برق و شرر
عالمِ امن و انصاف کے شوق میں، کتنی جانیں گئیں کتنا خوں بہہ چکا
کوئی منزل نہیں، کوئی حاصل نہیں، ساری تاریخِ انساں سفر در سفر۵۹؎

لیکن ان کے کلام میں ایسی مایوسی اور ناامیدی کا حصہ آٹے میں نمک کے برابر ہے جو بہت نمایاں محسوس نہیں ہوتا۔ بحیثیت مجموعی ان کی شاعری امید اور جذبے کا پیغام لیے ہوئے ہے۔

۷

نعیم صدیقی کی شاعری میں ایک ایسا عنصر بھی موجود ہے جو ان کے غوروفکر کا ترجمان ہے۔ ان کی غزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں ذہن فلسفیانہ اور مزاج شاعرانہ عطا کیا ہے۔ نکتہ آفرینی کی چند خوب صورت مثالیں دیکھیں: ؎

مجھ کو ٹھوکر لگی تو بولے خضر
دیکھنا یاں کہیں پہ منزل ہے ۶۰؎
اس کی گلی میں بکھری ہیں تادور کرچیاں
کچھ ٹوٹے دل ہیں، پھوٹے مقدر، شکستہ خواب ۶۱؎
نمنائیں حاضر ہیں لو خوں بہا لو
ہمارے ہی ذمہ رہا خوں بہا بھی۶۲؎
مے نہیں ہے تو چشم نم ہی سہی
تو نہیں ہے تو تیرا غم ہی سہی۶۳؎

نعیم صدیقی کا ذہن رسا کیسے کیسے نکتے پیدا کرتا اور کیسی کیسی موشگافیاں کرتا ہے، ملاحظہ کیجیے: ؎

حضور رحمت میں لائے مجرم مگر فرشتوں نے معذرت کی
رقم تھے جس میں گناہ اس کے وہ ساری فردِ حساب گم ہے۶۴؎
؎یہ دن کی بے قراریاں، یہ رات بھر کی کروٹیں
شعور کے گناہ کی سزا ہیں اور کچھ نہیں۶۵؎

ایسے ایک ایک شعر کی تشریح میں ورق کے ورق سیاہ کیے جا سکتے ہیں اورپڑھتے ہوئے قلب و ذہن عجیب و غریب لطف و کیف سے آشنا ہوتے ہیں۔

۸

علامہ اقبال نے اردو غزل کو یہ خوبی عطا کی تھی کہ غزلیہ اشعار کے درمیان یا آخر میں نعت کے کسی شعر کا اضافہ کر دیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے غزل کے پیرایہ اظہار میں بھی ذہنی و قلبی پریشانیوں پر اللہ اور نبیؐ پاک سے امداد طلب کرنے کی روایت کا اضافہ کیا ہے۔ نعیم صدیقی اس معاملے میں اقبال کے مقلد ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں توحید و رسالت کا تذکرہ یا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کا اظہار کرتے ہیں: ؎

حقیر ہو گئے دنیا و دیں کے سب اعزاز

جبیں پہ جب سے ترے آستاں کی خاک ملی۶۶؎
اپنا ہر ایک تیر غمِ دہر نے جب چلا لیا
بڑھ کے غمِ حبیبؐ نے مجھ کو گلے لگا لیا۶۷؎
جو قافلے رواں ہیں دیارِ حبیبؐ کو
بن کر غبار ان کے شریکِ سفر ہیں ہم۶۸؎

نعیم صدیقی کی خوبی یہ ہے کہ ایسے اشعار کہتے ہوئے غزل کے مخصوص لوازمات کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پیوند کاری کے بجائے حمد یا نعت کے اشعار غزل ہی کا حصہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔

۹

فنی اعتبار سے نعیم کی غزل کا مجموعی جائزہ تو آگے پیش کیا جائے گا، لیکن ان کی غزل کی ایک خوبی ایسی ہے جس کا بیان الگ سے کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ ان کے ہاں بہت سی غزلیں چھوٹی بحروں میں نظر آتی ہیں جو سہل ممتنع کی خوب صورت مثال ہیں۔ ان غزلوں میں شوخی اور سادگی کا حسین امتزاج نظر آتا ہے: ؎

کسی کی دوستی ہے اور ہم ہیں
زمانے کی ہنسی ہے اور ہم ہیں
سنیں سب کچھ مگر کچھ کہہ نہ پائیں
انوکھی بے بسی ہے اور ہم ہیں
امیدیں، حسرتیں اور آرزوئیں
فریبِ زندگی ہے اور ہم ہیں
جہادِ عاشقی ہے اور دل ہے
کڑی سر آ پڑی ہے اور ہم ہیں۶۹؎

اسی طرح کی ایک اور مثال دیکھیے: ؎

بڑی آزمایش ہے وہ اشکِ لرزاں
امڈ آئے لیکن ٹپکنے نہ پائے
وہی رند ہے رند اس میکدے کا
جو کھل کر پئے اور بہکنے نہ پائے
مزے آتشِ عاشقی کے جبھی ہیں
سلگتی رہے اور بھڑکنے نہ پائے۷۰؎

ذیل کے اشعار میں مضامین کی خوب صورتی کے علاوہ، الفاظ کی روانی اور جذبات کا بہاو دیکھنے کے قابل ہے اور خاص بات یہ ہے کہ مختصر بحر رکاوٹ ڈالنے کے بجائے خود مترنم ہو گئی ہے: ؎

دل پگھل کر شریک نِگہ ہو گیا
دیکھتے دیکھتے حادثہ ہو گیا
آرزووں کے جادو نے مارا ہمیں
اچھا خاصا تھا دل بت کدہ ہو گیا
آپ کی یاد آئی نشہ ہو گیا
گوشۂ خانقاہ میکدہ ہو گیا۷۱؎

اس طرح ذیل کی غزلیں بھی پوری کی پوری سہل ممتنع کی عمدہ مثالیں ہیں: ع

وعدوں پہ مچل مچل گئے ہم۷۲؎

ع

سہما ہوا درد سو گیا ہے۷۳؎

ع

مَے نہیں ہے تو چشمِ نم ہی سہی ۷۴؎

نعیم صدیقی نے ابتدا میں غزل کہنے سے اجتناب کیا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ وہ شعلہ خیال کے مقدمے میں بیان کرتے ہیں:

’’شروع شروع میں میرا رجحان یہ تھا کہ غزل کی مروجہ استعاریت ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہے اور اس تاثر کے پیدا کرنے میں قدیم شاعری کی ایسی تخلیقات کا بڑا دخل ہے جو پاکیزہ استعاریت سے آگے بڑھ کر صراحت، بلکہ کبھی کبھی عریانی و بیہودگی اور بازاری پن تک جا پہنچتی ہیں۔‘‘ ۷۵ـــہ

لیکن بعد میں شاعری کے بعض اعلیٰ نمونوں کو دیکھ کر انھوں نے اپنی رائے تبدیل کر لی، البتہ اس سلسلے میں وہ احتیاط کے دامن کوہمیشہ تھام کر چلے ہیں:

’’فن میں سب سے بڑی آزمایش یہی ہے کہ صاحبِ فن احساسات کی لہروں میں بے اختیار ہو کر بہتا نہ جائے بلکہ ان کو انضباط میں رکھے۔‘‘ ۷۶ـــہ

نعیم صدیقی کی غزل کا فنی اعتبار سے جائزہ لیتے ہوئے یہ خدشہ ذہن کو پریشان کر سکتا ہے کہ ایک مقصد و نظریے کو اپنا معشوق تصور کر کے شعر کہنے والے شاعر کے ہاں تغزل اور دیگر اوصاف غزل کا اہتمام آخر کہاں تک برقرار رہ سکے گا، لیکن اس غلط فہمی کو نعیم صدیقی خود ہی دور کر دیتے ہیں:

’’غزل کسی مقصدی پیغام کی جامعیت کو نہیں سہار سکتی بلکہ وہ صرف چند اشارات پیش کر سکتی ہے۔‘‘۷۷ـــہ

یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں غزل میں ’’مقصد‘‘کی جانب چند ’’اشارے‘‘ نظر آتے ہیں اور وہ بھی غزل کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور کسی طرح بھی اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔

نعیم صدیقی کے ہاں ہمیں نام نہاد جدیدیت کے برعکس روایت کی پیروی کا انداز نظر آتا ہے۔ زبان، موضوع اور لہجہ سب میں کلاسیکل رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ انھیں بحروں کے استعمال پر پورا عبور حاصل ہے۔ سہل ممتنع کی مثالیں تو گذشتہ صفحات میں دی گئی ہیں۔ طویل بحروں کا استعمال بھی اور اس میں اسلوب، تراکیب اور فضا میں فارسیت کا رنگ بھی جھلکتا نظر آتا ہے۔

نعیم صدیقی کے بعض اشعار نے تو بعض حلقوں میں اتنی مقبولیت حاصل کی ہے کہ ضرب المثل کہلانے کے مستحق ہیں: ؎

ہر پھول آستیں میں ہے کانٹا لیے ہوئے
اس باغِ پر بہار میں دامن بچا کے چل۷۸ـــہ

؎جنونِ شوق کہتا ہے کہ خود آگے نکل جاوں
متاع زندگی ساری کنارِ راہگزر رکھ دوں ۷۹ـــہ

؎جھکا کے سر کو کبھی زندگی ہوئی رسوا
کٹا کے سر کو کبھی سرفراز ہوتی رہی۸۰ـــہ

چراغ ہر سو جلا چلے ہم تم ان کو آگے جلائے رکھنا
روایتیں چند چلا چلے ہم تم ان کو آگے بڑھائے رکھنا۸۱ـــہ

گوناگوں شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ بعض اوقات ایسے اشعار بھی نعیم کی غزل میں آ جاتے ہیں جن میں بے رنگی کا احساس ہوتا ہے اور جن کا ذائقہ کھیر کھاتے ہوئے کڑوے بادام کے منہ میں آ جانے کا سا محسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ردیف و قافیہ کی ضرورت کے تحت یا اشعار کی تعداد میں اضافہ کے لیے انھیں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس نوعیت کی چند مثالیں دیکھیں:

گاڑی پہ بوجھ ہے اسے کچے پہ لے چلے
صاحب یہ دیکھو ٹوٹ چلی ہیں کمانیاں

پہنچے غزل یہ لالۂ صحرائی تک مری
چل اے نسیمِ صبح بہ سوئے جہانیاں۸۲ـــہ

صاف معلوم ہوتا ہے کہ ویرانیاں، جوانیاں، آسانیاں کے ساتھ کمانیاں اور جہانیاں کے اشعار بھرتی کے لیے شامل کیے گئے ہیں۔
چندایک اشعار میں صوتی تنافر ۱ے کا احساس بھی ہوتا ہے: ے

جنسِ غمِ دلدار دل دے کے خریدی
ترکِ غم دلدار مجھ سے تو نہ ہو گا۸۳ے
یوں شررِ شب کو اک خراج تو دیں
فرصتِ عمر دم دو دم ہی سہی۸۴ے

اوپر جن چند خامیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ کافی تلاش کے بعد ان کے کلام میں ملی ہیں۔ سرسری اور بعض اوقات گہرے مطالعے کے باوجود ایسی مثالیں نظر نہیں آتی ہیں۔ مجموعی طور پر زبان کے معاملے میں نعیم صدیقی بہت محتاط واقع ہوئے ہیں۔

المراجع

۱۔ نیاز فتح پوری، پیش لفظ، بیسویں صدی میں اردو غزل، ،(اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۸۷)،ص۱۳
۲۔ ، رشید احمد صدیقی ،جدید اردو غزل (مرتبہ ڈاکٹر حسین الرحمن)،(یونیورسل بکس اردو بازار لاہور۱۹۸۷)،ص۱۷
۳۔ سید عبداللہ ،مباحث، ،(علمی کتب خانہ،لاہور ۱۹۷۹)، ص۴۰۴
۴۔ ابواللیث صدیقی، غزل اور متغزلین، ، ص۵
۵۔ سید عابد علی عابد، اصول انتقاد ادبیات، ، (مجلس ترقی ادب،اردو بازار لاہور،۱۹۶۴،)ص۳۲۵
۶۔ یوسف حسین خان، اردو غزل،(، آئینہ ادب لاہور،۱۹۶۴)،ص۸۰
۷۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، (کشمیرتاب گھر، لاہور) ص۱۱۳
۸۔ ایضاً، ص۱۱۵
۹۔ رشید احمد صدیقی ،جدید اردو غزل ا، ص۲۳
۱۰۔ نظیر صدیقی، جدید اردو غزل ایک مطالعہ ، ص۱۰
۱۱۔ مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال بحیثیت شاعر، ، (مجلس ترقی ادب لاہور،۱۹۷۷،)ص۱۳
۱۲۔ مرتبہ سید معین الرحمن ،جدید اردو غزل، ، ص۲۳
۱۳۔ جدید اردو غزل ایک مطالعہ، ، ص۲۴
۱۴۔ ا ابشیر بدر ،آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ، ، ا(نجمن ترقی اردو ہند،نئی دہلی ۱۹۸۱)ص۳۷۰
۱۵۔ سیارہ اب بھی نعیم صدیقی کے زیر ادارت نکلتا ہے۔
۱۶۔ پیش لفظ، شعلہ خیال، ص۱۱
۱۷۔ سیارہ، جولائی ۷۰ء، ص ۶۹
۱۸۔ ایضاً، جنوری ۷۱ء، ص۷۶
۱۹۔ ایضاً، اگست ۸۳، ص۳۴۷
۲۰۔ ایضاً، فروری ۶۱، ص۸۰
۲۱۔ ایضاً، جنوری ۶۶ء، ص۸۵
۲۲۔ ایضاً، جون ۷۱ء، ص۶۲
۲۳۔ ایضاً، اگست ۶۴، ص۴۸
۲۴۔ ایضاً، مئی ۱۹۹۰ء، ص۲۷۶
۲۵۔ ایضاً، فروری ۱۹۶۳ء، ص۸۹
۲۶۔ ایضاً، اکتوبر ۱۹۷۱ء، ص۷۷
۲۷۔ شعلہ خیال، ص۷۳
۲۸۔ ایضاً، ص۷۶
۲۹۔سیارہ، جون ۶۸ء، ص۸۷
۳۰۔ ایضاً، اگست ۸۳ء، ص۳۴۶
۳۱۔ ایضاً، ستمبر، اکتوبر ۸۷ء، ص۱۹۹
۳۲۔ ایضاً، ستمبر ۶۴، ص۲۱
۳۳۔ مباحث، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص۳۹۷
۳۴۔ سیارہ، مارچ ۶۳ء، ص۸۳
۳۵۔ ایضاً، اپریل، مئی ۸۶ء، مئی ۱۴۳
۳۶۔ ایضاً، اکتوبر، نومبر ۷۶ء، ص۱۳۹
۳۷۔ ایضاً، نومبر ۷۱ء، ص۷۲
۳۸۔ ایضاً، ستمبر ۷۷ء، ص۶۳
۳۹۔ ایضاً، مئی ۱۹۹۰ء، ص۲۷۵
۴۰۔ ایضاً، جنوری ۸۹ء، ص۱۶۱

۴۱- ایضاً، اکتوبر ۶۷ء، ص۷۹
۴۲- ایضاً، جون ۷۷ء، ص۸۸
۴۳- ایضاً، ستمبر ۷۸ء، ص۴۹
۴۴- ایضاً، جون ۸۹ء، ص۱۷۱
۴۵- ایضا، اپریل ۷۱ء، ص۷۱
۴۶- ایضا، مارچ، اپریل، ۸۷ء، ص۱۴۴
۴۷- ایضا، مئی جون ۸۸ء، ص۱۶۰
۴۸- ایضاً، اکتوبر ۷۱ء، ص۷۹
۴۹- ایضاً، اکتوبر نومبر ۸۴ء، ص۱۰۸
۵۰- شعلہ خیال، ص۹۲
۵۱- ایضاً، ص۷۶
۵۲- سیارہ، اپریل ۶۹ء، ص۸۳
۵۳- ایضاً، جنوری ۶۹، ص۹۸
۵۴- ایضاً، اکتوبر، نومبر ۸۴ء، ص۱۰۷
۵۵- ایضاً، جون ۷۱ء، ص۶۲
۵۶- ایضاً، جون ۶۶ء، ص۷۸
۵۷- ایضاً، مئی ۹۰ء، ص۲۷۳
۵۸- ایضاً، جنوری ۸۹ء، ص۱۶۲
۵۹- ایضاً، مارچ ۶۹ء، ص۶۵
۶۰- ایضاً، سالنامہ ۱۹۹۱ء، ص۱۶۶
۶۱- ایضاً، مئی ۹۰ء، ص۲۷۵
۶۲- ایضاً، جون ۶۸، ص۸۷
۶۳- ایضاً، اکتوبر ۶۴ء، ص۷۲
۶۴- ایضاً، ستمبر ۶۴ء، ص۲۱
۶۵- شعلہ خیال، نعیم صدیقی، ص۷۵
۶۶- سیارہ، اپریل ۶۶ء، ص۸۴
۶۷- ایضاً، اگست ۶۴، ص۴۸
۶۸- ایضاً، اکتوبر ۶۷ء، ص۸۰
۶۹- شعلہ خیال، نعیم صدیقی، ص۶۳، ۶۴
۷۰- ایضاً، ص۹۷
۷۱- سیارہ، ستمبر، اکتوبر ۸۶ء، ص۲۳۸
۷۲- ایضاً، مارچ، اپریل ۸۷ء، ص۱۴۶
۷۳- ایضاً، اگست ۶۸ء، ص۷۱
۷۴- ایضاً، اکتوبر ۶۴ء، ص۷۲
۷۵- شعلہ خیال، نعیم صدیقی، ص۱۴
۷۶- ایضاً، ص۱۵
۷۷- ایضاً، ص۱۷
۷۸- ایضاً، ص۶۰
۷۹- سیارہ، جولائی ۷۰ء، ص۶۹
۸۰- شعلہ خیال، نعیم صدیقی، ص۹۰
۸۱- سیارہ، جون ۸۹ء، ص۱۷۱
۸۲- ایضاً، جنوری ۸۹ء، ص۱۶۲
۸۳- ایضاً، اپریل ۶۶ء، ص۸۶
۸۴- ایضاً، اکتوبر ۶۴ء، ص۷۲